© rasailojaraid.com

سید مودودیؒ :

اردو ادب کے سِلسلۃُ الذَّھَب کی آخری کڑی

پروفیسر آسی ضیائی ○

اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے تک اردو ادب کی خوش قسمتی سے ملک میں چند ایسی ہستیاں اٹھیں جن کی بدولت کم و بیش ہر ربع صدی میں اردو ادب کچھ انقلابی قدروں کو اپناتا ہوا اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا رہا۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ نظم یا نثر یا دونوں کو نئے انقلابی موڑ دینے والے یہ ادیب حضرات زیادہ تر ۲۰' ۲۰ سال بعد پیدا ہوتے رہے۔ یوں تو اس پورے عرصے میں کثیر تعداد میں شاعر اور نثرنگار پیدا ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں' لیکن ان سب کی حیثیت راستے پر چلنے والے مسافروں کی ہے' سڑک تیار کرنے اور قافلوں کی رہنمائی کرنے والے حسب معمول چند ہی ہیں۔ میرے شمار کے مطابق صرف سات۔ یہ ایسی سنہری زنجیر ہے جس کی ہر کڑی دوسری سے مربوط' مگر اپنی جگہ منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ مگر اردو کی یہ بدقسمتی عرصے تک رہی کہ اپنے چند موروثی ذہنی تحفظات کے باعث ان میں سے بعض کو نقادوں نے ادب کی تاریخ میں جگہ ہی نہ دی۔ وہ سات ادیب حسب ذیل ہیں:

۱۔ شاہ اسماعیل شہید (پیدائش' ۱۷۷۷ء) ۲۔ اسد اللہ غالب (۱۷۹۷ء) ۳۔ سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء) ۴۔ مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء) ۵۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء) ۶۔ علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء) ۷۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء)۔

شاہ صاحب کا سال پیدائش بعض تاریخوں کی رو سے ۱۷۷۹ء ثابت ہوتا ہے' لیکن وہ بھی یقین سے

○ ریسرچ اسکالر' ادارہ معارف اسلامی' منصورہ' لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تاریخ متعین نہیں کرتیں۔ اس لیے ہم نے اپنی سہولت کی خاطر ۱۷۷۷ء فرض کر لی ہے تاکہ آیندہ کے ادیبوں کی پیدائش کا فرق، (جو اقبال تک ۲۰، ۲۰ سال کا ہے) برقرار رہے۔ خود اقبال کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف ہے تاہم، ہم نے سرکاری طور پر متعین کردہ تاریخ کو اپنے مفید مطلب پا کر اختیار کیا ہے۔ اس طرح، اس سلسلے کے سب ادیب، ماسوائے سید مودودیؒ کے ۲۰، ۲۰ سال کے فرق سے پیدا ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ یقیناً دل چسپ اور خوش گوار صورت حال ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ آج بھی نقادان کرام اس فہرست کو دیکھ کر چونکیں گے، کہ میں نے اس ادبی بدعت کی جسارت کیونکر کی، لیکن میں توقع کرتا ہوں کہ اس اجمال کی تفصیل معلوم کر کے وہ میرے نقطہ نظر سے واقف ضرور ہو جائیں گے، چاہے اس سے اتفاق نہ کریں۔

پہلی کڑی ، شاہ اسماعیل شہید: اس فہرست کا آغاز شاہ اسماعیل شہید سے ہوتا ہے، جو اگرچہ شعر بھی کہہ لیتے تھے، لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے ان کے اشعار کی کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ظلم ان پر ضرور ہوا ہے کہ آج تک نثرنگاروں کی صف میں ان کو کوئی اہمیت نہ دی گئی، حالانکہ ان کی مختصر کتاب (رسالہ) تقویت الایمان، میرے نزدیک جدید اردو نثر کی نقیب ہے۔ یہ بات میں اپنے ایک سابق مضمون "جدید اردو نثر کا ایک فراموش کردہ سنگ میل" میں بھی ثابت کر چکا ہوں۔ یہاں مختصراً یہ کہنا ہے کہ اس کتاب سے پہلے جس طرح ہندی مسلمانوں کا ذہن دین اور دنیا کے دو الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا تھا، اسی طرح اس عہد کی تصانیف میں بھی یہ دوئی بالکل صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ یعنی ایک سلسلہ تصانیف وہ تھا جس کو ہم افادی ادب میں شمار کر سکتے ہیں اور دوسرا وہ جسے تفریحی ادب میں رکھا جا سکتا ہے۔ افادی ادب ان دنوں مذہبی ادب کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ واقعات کربلا پر مشتمل مجلس ہو یا ترجمہ و تفسیر قرآن، سب اس ایک شعبے میں آتے ہیں۔

رہا تفریحی ادب تو اس میں خواہ تحسین کی مرصع عبارت پر مشتمل نوطرز مرصع ہو یا میرامن کی ٹھیٹ "اردو زبان" میں لکھی ہوئی باغ و بہار، سب کا مقصد سوائے ذہنی عیاشی کے اور کچھ نہ تھا۔ افادی ادب کے مصنفوں کی کوشش ہوتی تھی کہ عبارت کو ہر طرح کی ادبی چاشنی سے پاک رکھ کر اسے اہل مدرسہ و خانقاہ کے پڑھنے کے لائق بنایا جائے۔ جب کہ تفریحی ادب کے خالق اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ اس میں تخیل اور انشا پردازی کو زیادہ سے زیادہ فوق الفطری رکھا جائے تاکہ صرف گنتی کے رؤسا اور ذی علم لوگ ہی اس سے تسکین حاصل کر سکیں۔ گویا مذہبی مصنفین کے لیے ذہنی لذت شجر ممنوعہ تھی اور دوسرے (تفریحی) ادیب اس بات سے مطلق بے خوف تھے کہ ان کی گمراہ کن مبالغہ آرائی اور بے راہ روی گناہ بھی بن سکتی ہے۔ یہ دونوں طبقے یہ فراموش کر چکے تھے کہ کتاب ہدایت قرآن اور ارشادات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسولؐ (احادیث) دونوں بیک وقت اعلیٰ ادبیت اور ہدایت کے حامل ہیں، اور مسلمان ادیبوں کے لیے یہ اس معاملے میں صحیح ترین قابل تقلید نمونہ ہیں۔ اس پر مستزاد، ایک بات دونوں طبقوں میں مشترک تھی اور وہ تھی "اِخفائے ذات"۔ آپ اس عہد کی، بلکہ انیسویں صدی کے آخر تک اس مکتب فکر کی تمام تصانیف پڑھ جایئے، آپ کو مصنف کا ذاتی رجحان، اس کا اپنا نقطہ نظر، زندگی اور اس کے مسائل پر اس کا ذاتی تبصرہ بالکل معلوم نہ ہو سکے گا خواہ وہ کوئی داستان لکھ رہا ہو یا حدیث کا ترجمہ و تشریح کر رہا ہو۔ داستان کا مصنف ہر قدم پر اگلے راوی کا حوالہ دے کر اپنی ذمہ داری صرف نقل روایت تک محدود رکھے گا، چاہے اس نے اپنی طرف سے تخیل میں کتنی ہی وسیع و بلند جولانیاں دکھائی ہوں، اور دینی کتاب کا مؤلف اپنے حضرت استاذ و مرشد یا زیادہ سے زیادہ اپنے مکتب فکر (مذہب) کے فرمودات پیش کر دینے سے آگے نہ جائے گا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ کچھ تو مسلمانوں کے ذہنوں میں صدیوں کی رچی ہوئی تقلید پرستی تھی، جس نے خود کچھ سوچنے اور اختراع کرنے کی طاقت سلب کر لی تھی، اور کچھ زوال آمادہ تہذیب کا کرشمہ تھا، جس میں شرافت و متانت کی مثبت قدریں اپنانے کی ہمت نہیں رہتی، صرف منفی قدروں پر جم جانا ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ لکھنے والا اپنے مذہبی یا تہذیبی خول میں خود کو اس طرح چھپائے رکھتا ہے کہ اس کی تصنیف میں اس کی شناخت مطلق نہیں ہو سکتی۔

ان حالات میں تقویت الایمان وہ پہلی تصنیف ہے جس نے تحریر کی یہ تمام قلعہ بندیاں توڑ پھینکیں اور اردو ادب میں پہلی بار "اظہار ذات" کا دروازہ کھولا اور اس میں بیک وقت افادی اور ادبی قدریں سمو دیں۔ یہ پہلی کتاب ہے جس کو پڑھ کر مصنف کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس سے اتفاق یا اختلاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ غالباً اس کتاب کی حمایت یا مخالفت میں آج تک جتنا تحریری سرمایہ اردو کے حصے میں آیا ہے کسی اور کتاب کو میسر نہ ہوا۔ اور اس کو پڑھتے وقت خالص اعتقادی مسئلے پر مصنف کی تحریر کی شگفتگی، روانی اور زور کا ایسا لطف آتا ہے جیسے یہ کوئی خشک مذہبی بحث نہیں، ایک رواں دواں مقرر کی تقریر ہے جسے ہم نظروں کے راستے "سن کر" متاثر اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ کہ شاہ صاحبؒ سے پہلے اردو کو زبان تو مل چکی تھی مگر یہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اردو کو ذہن بھی عطا کیا اور یہی ان کا انقلابی کارنامہ ہے۔

دوسری کڑی، اسد اللہ غالب: شاہ شہید جس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں اس کی دوسری کڑی غالب کو شمار کرنا بظاہر اجتماع ضدین سا معلوم ہوگا۔ مگر ادب کی مملکت میں تو صوفی شب زندہ دار اور رند شاہد باز سمیت سبھی برابر کی شہریت کے حامل ہیں۔ مکان کی تعمیر کرنا ہو تو مسلم اور غیر مسلم معمار کی تمیز نہیں کی جاتی۔ جو جتنا کام کرے گا اسی کے موافق اس کا مرتبہ و مقام متعین ہوگا۔ اور پھر یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غالب نے بیچ بیچ اسی رخ میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس رخ کا تعین سب سے پہلے شاہ صاحب نے کیا تھا۔ سب سے پہلے غالب کے نثری کارنامے کو دیکھیے' انھوں نے مکتوب نگاری کے زمین و آسمان بدل دیے۔ اگرچہ میں غالب کے خطوط کو نثری کام شمار نہیں کرتا' مگر اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان سے پہلے خطوط بھی اس عہد کی نثرنگاری ہی کا ایک نمونہ ہوتے تھے۔ وہی القاب و آداب اور عبارت آرائی کے پُرتکلف غلافوں میں اِخفاے ذات کا اہتمام' جو اس عہد کی معیاری ادبی کتابوں کا طرۂ امتیاز تھا' خطوط میں بھی کیا جاتا تھا۔ غالب نے خطوط میں بھی اظہار ذات کا اہتمام کیا اور انھیں بے تکلف مکالمہ بنا دیا' اور اس طرح مکتوب نگاری کی روایت ہی بدل ڈالی۔

اور اب آیئے غالب کی شاعری پر۔ تمام نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ غالب ایک جدت پسند شاعر تھے۔ ان کے کلام نے اردو میں تحلیلی شاعری کا آغاز کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے پہلے اردو کا شاعر جذبے کو جوں کا توں نظم کر دیتا تھا جو ترکیبی شاعری کی خصوصیت ہے۔ غالب نے نہ صرف جذب و خیال کی تحلیل کی بلکہ پہلی بار بے لگام تخیل کو عقل کے ذریعے سڈول بنایا' اور ہر وقت "تصور جاناں" میں بیٹھے رہنے کے خلاف فطرت ادّعا کو مسترد کر کے غم روزگار کی اہمیت بھی جتائی۔ گویا ان کی بدولت اردو شاعری' جو داستانوں کی طرح خالص وہمی اور خیالی مفروضات کے بل بوتے پر چل رہی تھی' دنیائے آب و گل کی حقیقت کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کے قابل بھی ہوئی۔ مثالوں کا یہاں موقع اور گنجایش نہیں' اور نہ اہل علم کے لیے اس کی ضرورت ہی ہے کہ غالب کی عقلیت و واقعیت پسندی ثابت کرنے کے لیے ان کے کلام سے مثالیں دی جائیں۔ بہرحال مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ غالب ہی کی بدولت بعد میں آنے والوں کو یہ آسانی ہوئی کہ مسلم قوم کو تصورات و توہمات سے نکالنے کی جدوجہد کی جائے اور اس طرح دیکھا جائے تو شاہ اسماعیل کی پہلی آواز--- تقلید جامد کو توڑنے اور وہمی' بے اصل عقائد کا پول کھولنے کی کوشش کو شعر کے میدان میں بلند کرنے کا کام غالب ہی نے شروع کیا۔ اور یہ بھی بہرحال ثابت ہے کہ غالب اپنے نہایت گہرے دوست' مگر غیر مشروط تقلید کے علم بردار' مولانا فضل حق خیرآبادی کے بجائے ان کے حریف شاہ اسماعیل سے ذہنی طور پر قریب تھے۔

اس طرح غالب وہ ہستی ہیں جنھوں نے اردو کو ذہن مل جانے کے بعد اسے عقل سے کام لینا سکھایا۔

تیسری کڑی' سرسید احمد خاں: انقلاب ۱۸۵۷ء تک ہندی مسلم معاشرے میں اتنی بیداری آگئی تھی کہ اس کے افراد خیالی جنت میں بسے رہنے کے بجائے عقل و ہوش سے کام لے سکیں۔ ادب میں اس کا ثبوت' جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' شاہ شہید اور غالب کی تحریروں سے ملتا ہے۔ اب یہ محض اتفاق نہیں کہ سرسید نے ان دونوں بزرگوں کے کام کو آگے بڑھایا اور اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔ یہ معلوم ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید کو شاہ صاحب کے وعظ اپنے لڑکپن میں سننے کا اتفاق ہوا تھا، بلکہ ان کا خاندان بھی "شاہی خاندان" (ولی اللّٰہی) کا معتقد تھا۔ نیز، غالب سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ لہٰذا سرسید نے اپنی اصلاحی کوششوں میں ان دونوں سے خاصا استفادہ کیا۔ ان کی تحریر بڑی حد تک تقویت الایمان کا چربا ہے۔ اگرچہ ان کے موضوعات ذرا مختلف ہیں۔ اسی طرح غالب کی سی واقعیت پسندی اور جچی تلی، مختصر مگر جامع عبارت لکھنے کا اہتمام سرسید بھی کرتے ہیں۔ البتہ ان کا کام، مختصر الفاظ میں، یہ ہے کہ انھوں نے اجتماعی عقل کو منظم کیا اور مسلمانوں میں ان کے ایک "ملت" ہونے کا شعور پیدا کیا۔ شاہ اسماعیل کے بعد وہ پہلے ادیب ہیں جن کے مخاطب افراد، گروہ یا طبقے نہیں، پورا ہندی مسلم معاشرہ ہے۔ شاہ صاحب کی مخاطب بھی پوری ملت ہے۔ مگر ایک تو ان کا موضوع ایک ہی ہے اور اس پر بھی انھیں صرف ایک ننھے منے سے رسالے میں قلم فرسائی کا موقع ملا، (ان کی باقی تحریریں فارسی میں ہیں) دوسرے اس کی بھی وسیع پیمانے پر جلد اشاعت نہ ہو سکی۔ برخلاف اس کے، سرسید کے موضوعات اور تصانیف بھی خاصی تعداد میں ہیں اور انھیں اپنی زندگی ہی میں وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت کے ذرائع بھی خوب میسر آئے۔

سرسید کے طرز فکر سے آج ہم اختلاف بھی کر سکتے ہیں، مگر ان کے خلوص سے انکار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اسلوب تحریر میں زور، سادگی، قطعیت اور اثرانگیزی اس درجے کی ہے کہ شدید مخالفت کے باوجود ان کی تحریک آگے ہی آگے بڑھتی گئی، اور ان کے انداز بیاں کو ان کے کٹر مخالف بھی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ سرسید ہی تھے جنھوں نے اپنی دنیا میں مگن رہنے والے بقلم خود "اہل زبان" حضرات کی اجارہ داری توڑی، اور نظم و نثر کو ایک چھوٹے سے گروہ کی ملکیت سے نکال کر پورے ملک کی جاگیر بنا دیا۔ انھوں نے دہلی لکھنؤ کے دعوؤں کا جھوٹا طلسم پاش پاش کیا، اور زبان و ادب کا نیا مرکز--- علی گڑھ--- قائم ہوا، جہاں سارے ہندی مسلمانوں کی نمایندگی ہونے کے باعث ایک نیا، باوقار اور صحیح معنوں میں افادی ادب پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور اس ادب کے خالق نہ تو دہلی یا لکھنؤ کے مفتخر نام لیوا تھے اور نہ روایتی "شرفا" کے خاندان سے متعلق۔ اور اس طرح ادب کو عوامی بنانے کا شرف بھی سرسید ہی کو حاصل ہوا۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید نے اردو ادب میں پیدا ہو جانے والی عقل کو اجتماعی عقل بنا کر منظم کر دیا۔

چوتھی کڑی، مولانا الطاف حسین حالی: اگرچہ عام طور پر حالی کو سرسید تحریک سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا، پھر بھی حالی کو سرسید کا نرا تکملہ کہنا درست نہ ہوگا۔ بے شک وہ سرسید سے بہت متاثر اور ان کے معاون تھے، لیکن ادب میں ان کا اپنا مقام، اپنی کارگزاری اور اپنا اسلوب ہے۔ نظم اور نثر دونوں میں ان کا جدا جدا کام ہے اور جدا جدا ہی اس کے اثرات بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نئے قواعد کا پابند بنایا، شعر پرکھنے کے واضح اور معین معیار مقرر کیے، اور سابق شعرا کے برخلاف شعر کو معاشرے کی شعوری نمایندگی دی۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرسید کی بدولت مسلم معاشرے کو اپنے ایک ملت ہونے کا احساس قائم ہو چلا تھا۔ اب حالی نے اسی ملت کا ایک فرد ہونے کے ناتے اپنی شاعری میں وہ باتیں کہیں جو یہ ملت غیر شعوری طور پر جانتی اور چاہتی تھی۔ ملت کا مسلم ہونا، اسلامی اقدار سے اس کا دور ہوتے جانا، اس کا شان دار ماضی اور اس کا قابل افسوس حال---- یہ اور ایسے ہی معاملات و مسائل ہیں جن کو خلوص و دردمندی کے رنگ میں رنگ کر حالی نے شعر کہے۔ ان کی مسدس تو بہرحال ایک شاہکار ہے ہی، جس میں مسلمانوں کے ماضی و حال کا تقابل کر کے انھوں نے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہی ہے، ان کی غزلیں بھی ایک نئی، ابھرتی ہوئی تہذیب کی داغ بیل ڈالتی نظر آتی ہیں۔ دُور از کار تخیل سے پرہیز، لچر لذتیت اور بازاری پن سے اجتناب، شریفانہ وقار اور رکھ رکھاؤ اور جمہوری شعور کا آغاز، یہ تمام خصوصیات غزل میں ہمیں پہلی بار حالی ہی کے ہاں ملتی ہیں۔ اس میں وہ جدید دور کے شائستہ مزاج، متوسط طبقے کے شریف اور مہذب فرد نظر آتے ہیں جس کے تخیل میں مسائل حیات پر تبصرہ اور تجزیہ بھی ملتا ہے اور اپنے عہد کے معاملات کی طرف اشارے بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ عشق کا فطری جذبہ بھی، جو سابق شعرا کے برخلاف، مقصود زندگی نہیں، منجملہ دیگر جذبات کے محض ایک جذبہ ہے۔ ان کا محبوب بھی شاہی دور کا مطلق العنان، غیر ذمہ دار، ستم شعار یا زنان بازاری کی طرح پُر تصنع، چیچھوری عادات کا مالک، جنس زدہ شخص نہیں، جمہوری دور کا باکردار فرد ہے جس سے غلط قسم کی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔

اب رہی حالی کی نثر، تو ان کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں جدید زبان لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ وہ زبان ہے جس کا تتبع آج تک کیا جا رہا ہے۔ سرسید تک کے ہاں کسی حد تک پرانی زبان کے اثرات باقی رہ گئے ہیں۔ آوے، جاوے، کرکر اور جملوں کی ساخت میں پرانی طرز کی تقدیم و تاخیر، وغیرہ سرسید بھی بے تکلف لکھ جاتے ہیں، کیونکہ وہ بہرحال دہلی کے قدیم اشراف میں سے تھے اور قدمائی (کلاسیکل) زبان ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ حالی نہ دہلی کے تھے نہ لکھنؤ کے کہ کلاسیکی روایات پر عمل کرنا ان کی مجبوری ہوتا۔ انھوں نے وہ زبان لکھی جو مخصوص طبقات کے بجائے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو راس آگئی اور آج بھی نئی ہے۔

دوسرا کارنامہ ان کا ماضی سے رشتہ جوڑنا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا کارنامہ وہ تین سوانح حیات ہیں جو انھوں نے سعدی، غالب اور سرسید کی لکھیں۔ اول تو اردو میں سوانح نگاری کا اس سے پہلے وجود ہی نہ تھا، صرف تذکروں میں ضمنی طور پر بعض قدما کا ذکر آجاتا تھا، اور اس ذکر میں بھی ان بزرگوں کی واضح تصویر تو درکنار، مدح سرائی کی لفاظی میں ان کی انفرادیت بھی نظر نہ آتی تھی۔ حالی نے اپنی تصانیف میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے ممدوحوں کو ایسے زندہ و متحرک بنا کر دکھا دیا کہ ہر دور کا قاری ان سے اپنا رشتہ تلاش کر سکتا ہے۔ یہ تینوں اشخاص (سعدی، غالب، سرسید) حالی کے ہاں فوق البشر اور ناقابل ادراک مقدس بن کر نہیں نمودار ہوتے بلکہ اسی جہان آب و گل کے رہنے والے گوشت پوست کے انسان بن کر ہم سے متعارف ہوتے ہیں، اور ہم سے اندھی عقیدت کے بجائے باشعور محبت اور سچے احترام کے طالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح حالی کا مقدمہ شعروشاعری ہمیں اپنے صدیوں پر پھیلے ہوئے ادبی سرمائے پر صحیح، متوازن اور ٹھوس استحسانی نظر ڈالنے کا ڈھب سکھاتا ہے، تاکہ ہم ماضی کو بتوں کی طرح طاقوں میں سجا کر اس کے آگے ڈنڈوت کرتے رہنے کے بجائے اس سے استفادہ کریں، اس کی خوبیوں کو اپنائیں اور اس کی خامیوں سے سبق لیں۔ دوسرے الفاظ میں، حالی کا مقدمہ ہمیں کاغذی نہیں، سچ مچ کے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ ماضی کا ادب تبرک نہیں جسے چوم کر آنکھوں سے لگا لینا ہی ہمارا فرض ہو، بلکہ وہ ہماری میراث ہے جسے مسلسل سنوارتے رہنا ہماری ضرورت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس ہندی معاشرے کو سرسید نے ادب میں منظم عقل بخشی تھی، حالی نے اسے ادب میں اس عقل سے کام لینا اور اجتماعی ہمدردی کے لیے کام کرنا سکھایا۔

پانچویں کڑی، مولانا شبلی نعمانی: حالی تک پہنچتے پہنچتے ہمارا ادب شعور اور عقل سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔ اب ضرورت تھی علم کی، کیونکہ شعور اور عقل کا ارتقا علم کے بغیر ناممکن ہے اور علم کے لیے تحقیق و کاوش کے علاوہ دقت نظر اور صحیح قوت فیصلہ ضروری ہے۔ یہ تمام اوصاف ادب میں پہلی بار داخل کرنے والی ہستی مولانا شبلی تھے۔ ان سے پہلے اگرچہ حالی اور محمد حسین آزاد بھی اس سلسلے میں کچھ کام کر چکے تھے مگر خالص علمی نقطۂ نظر سے اس کی اتنی اہمیت نہیں۔ حالی نے تین سوانح لکھیں۔ جن میں سے دو ان اشخاص سے متعلق تھیں جن سے حالی کے براہ راست تعلقات تھے اور ان میں انھیں تحقیق یا ریسرچ کی نوبت کم ہی آئی اور آزاد کی تحقیق کا زیادہ تر دائرہ کار لسانیات، بالخصوص فارسی زبان میں ہے، جس کی افادیت کم از کم اس زمانے میں--- یعنی جب اردو ادب اپنے بالکل ابتدائی ارتقا کے مراحل میں تھا--- برائے نام تھی۔ ان کے برخلاف شبلی نے تحقیق و تاریخ نگاری کا ایک بلند معیار قائم کیا اور تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا، ماضی سے جو رشتہ حالی نے جوڑنے کی ابتدا کی تھی اسے مستحکم کیا اور صرف شعروادب ہی کے ذکر پر بس نہ کی بلکہ مسلمانوں کی تقریباً تمام اہم فکری و عملی کاوشوں کو اردو میں منتقل کرنے کا باب وا کر دیا۔ اپنے کام کو جاری رکھنے کی غرض سے ایسے ادارے قائم کیے جو آج تک ان کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر کام کر رہے ہیں، بلکہ ان کی تحریک سے ویسے ہی دیگر ادارے بھی ملک میں قائم ہوتے چلے گئے اور ان سب باتوں کے علاوہ تحریر کا وہ اسلوب ایجاد کیا جو بیک وقت علمی و ادبی تھا۔ اس میں سرسید کی سی قطعیت اور زور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استدلال، حالی کی سی سادگی و روانی اور شاہ اسماعیل کی سی گرمی گفتار بھی تھی اور خود ان کی اپنی شگفتگی، عالمانہ وقار اور بالغ نظری جسے عربیت کے ذوق نے جوامع الکلم کی خصوصیات بھی دے دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا ادب حالی کی نسبت شبلی سے زیادہ متاثر ہوا ہے، اور ہمارے ادب کے مؤرخوں نے شبلی کی "مذہبیت" کے باوجود انھیں ادبی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام دیا ہے، گویا وہ پہلے مولوی ہیں جنھیں "ادیب" بھی تسلیم کیا گیا۔ ان سے ذرا پہلے ڈاکٹر نذیر احمد بھی مولوی تھے، لیکن ادب میں ان کی مولویت دبی ہوئی ہے اور دینی موضوعات میں سے ایک آدھ ہی پر انھوں نے کچھ کام کیا ہے اور وہ بھی اتنا معروف و مقبول نہیں ہوا۔ بہرصورت ادب میں دین و دنیا کی جو تفریق اوپر سے مسلم چلی آرہی تھی، اسے پہلے شاہ شہید نے مٹانے کا کام کیا، لیکن اس کی تکمیل شبلی کے ہاتھوں ہوئی۔

شبلی کی تصانیف و موضوعات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ چند سطور میں اس کا اجمالی ذکر بھی مشکل ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی بدولت اردو ادب میں بالفاظ اقبال "عجم کا حسن طبیعت" اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ اور ان کی تصانیف نے ہمارے اندر مسلم ملت ہونے کا واضح شعور اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑ کر پیدا کیا۔

چھٹی کڑی، علامہ محمد اقبال: یوں تو اقبال کو ہمارے علما، ادبا، شعرا سے لے کر عوام کے ایک ایک فرد تک اپنا ملی شاعر مان کر اس پر فخر کرتے ہیں، لیکن ان کی توصیف و تحسین کا بیشتر حصہ جذباتی اور بے مصرف ہوتا ہے۔ بہت کم حضرات نے سنجیدگی سے اقبال کے حقیقی کارنامے اور ملت پر اس کے احسان کا جائزہ لیا ہے، اور اس طرف تو بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے کہ اقبال کے افکار و تخیل کی تشکیل میں اردو ادب کے گذشتہ ارتقائی مراحل کا اصل حصہ ہے۔ لوگوں نے اقبال کا ذہنی رشتہ نطشے، رومی، برگسان وغیرہ سے جوڑنے میں تو خاصی محنت سے کام لیا، لیکن اس پر غور نہ کیا کہ خود اردو ادب میں ان سے پہلے گزرنے والے اساطین نے ان کے لیے کیا ترکہ چھوڑا، جسے انھوں نے مزید ترقی اور جلا بخشی۔ درحقیقت اقبال کو اپنے ان ادبی اسلاف --- حالی، شبلی اور سرسید سے جو کچھ ملا اسی پر انھوں نے اپنی شاعری اور فکر کی عمارت اٹھائی۔ بیرونی مفکرین نے تو محض اس عمارت کو تقویت دینے کا مسالہ ہی مہیا کیا۔

اقبال تک پہنچتے پہنچتے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اردو ادب نے برصغیر کے مسلمانوں کو عقل، فکر، علم اور ملی احساس کی نعمتیں عطا کر دی تھیں۔ اب ادب ذہنی عیاشی یا تقلیدی عقائد کو مستحکم کرنے والی چیز نہیں رہ گیا تھا۔ مسلم ملت کو اپنی زبوں حالی اور زیاں کاری کا اندازہ ہو چلا تھا۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہو چلے تھے کہ برصغیر میں صدیاں بسر کر چکنے کے باوجود ان کا قلبی و ذہنی تعلق اسلام کے سرچشمے سرزمین حجاز سے ہونے کے باعث وہ آج بھی اس ملک میں اجنبی ہیں، اور انھیں اپنا تشخص اتنا عزیز ہے کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری (نسلی) قومیتوں کی طرح اس کان نمک میں نمک بن جانے پر آمادہ نہیں۔ اب وہ غیر شعوری طور پر اس بات کے طالب تھے کہ انھیں کوئی ایسی تدبیر سجھائی جائے جس سے وہ الگ تشخص رکھتے ہوئے اپنا وجود منوا سکیں اور اس پر فخر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب مسلمان اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اور یہ جان لیں کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح محض ایک نسلی، تہذیبی یا جغرافیائی نسبت سے ایک قوم نہیں بلکہ ایک اصولی ملت ہیں اور اس اعتبار سے ان کی انفرادیت تبھی برقرار رہ سکتی ہے جب وہ ان تنگ حد بندیوں (نسل، رنگ وغیرہ) سے آزاد ہو کر اپنا بین الاقوامی بلکہ بین الانسانی ہونا اچھی طرح معلوم کرلیں، بالفاظ دیگر، اپنی خودی پہچان لیں۔

یہ تسلسل افکار کا ایک منطقی نتیجہ تھا جسے اب تک کوئی ادیب یا مفکر شعوری طور پر نہ سمجھ پایا تھا، کیونکہ اس کے لیے پچھلی صدی تک حالات سازگار نہ تھے۔ البتہ بیسویں صدی آنے کے بعد اردو ادب کا فکری سفر اس منزل تک جاری رکھنے کے لیے ایک ذہین، فلسفی اور صاحبِ دل مزاج شناسِ ملت کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت اقبال نے پوری کر دی۔ ان کے ابتدائی کلام سے اخیر تک کی شاعری میں ان کے ارتقاے تفکر کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کو محض نام کا مسلمان سمجھنے کے بجائے "حقائق ابدی کی اساس" یاد دلانا اور وقت کے تازہ خدا "قومیت" یا "وطنیت" کی پرستش سے باز رکھنے کی کوشش کرنا، اور اس کے بجائے "حرم کی پاسبانی" پر اکسانا، اقبال نے پورے دانشورانہ اور فلسفیانہ سلسلہ استدلال کے ذریعے حق سمجھ کر اپنا مشن بنایا۔ ان کی بدولت ادب میں خیالات کی جو نئی انقلابی رو داخل ہوئی وہ صحیح معنوں میں سرسید تحریک کو نیا موڑ دکھانے والی ثابت ہوئی۔ اقبال کے کارنامے کو مختصراً اس طرح سمیٹا جا سکتا ہے کہ:

(۱) اقبال نے تنگ قومیت سے نکل کر مسلمانوں کو بین الاسلامی ملت کا جز ہونے کا احساس دلایا۔

(۲) تصوف اور غلامی (اپنے بادشاہوں، اکابر یا غیر ملکی آقاؤں سب کی غلامی) نے جمود اور منفی اخلاقیات میں مسلمانوں کو جکڑ رکھا تھا، اقبال نے اس سے نجات پانے کا راستہ خود شناسی کے ذریعے سکھایا۔

(۳) مخالفت سے مزاحم ہونا اور شر سے ٹکرا کر ختم ہو جانے کے بجائے رد عمل کے طور پر خیر کی طرف بڑھنے کی دعوت دی۔ گویا وسعت پذیری، خود اعتمادی اور رد عمل--- یہ وہ اہم ترین رجحانات تھے جو اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت کو سکھائے اور اس پر مستزاد، روشن مستقبل پر یقین کامل کا تحفہ بھی عطا کیا، جو اس اعتبار سے اہم ترین ہے کہ یہ محض نعرہ بازی یا کھوکھلی جذباتیت کی پیداوار نہیں، ایک فطری اور منطقی نتیجہ تھا، اس تسلسل افکار کا جو اقبال پیش کر رہے تھے اور اسی لیے اقبال کو مستقبل کا شاعر بھی کہا گیا ہے۔

میں نے نہایت سرسری اور اجمالی خاکہ اردو ادب کا گزشتہ صدی تک میں پیش کیا ہے، اور اگر حالات نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجازت دی یا اس پر اہل علم نے بحث کا دروازہ کھولا تو اس کی تفصیلات میں بھی جایا جا سکتا ہے۔ البتہ ہمارے ادب کی تاریخ جس طرح میرے نزدیک وقفے وقفے کے بعد اہم تر موڑ مڑتی آ رہی ہے اس نہج پر آج تک ہمارے مورخین ادب نے اسے مدون و مرتب نہ کر کے ادب کے طالب علموں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ تاریخ صرف واقعات کی کھتونی نہیں ہوتی، وہ ایک محافظ خانہ، ایک رجحان پیا اور ایک آیندہ کا مشیر (indicator) بھی ہوتی ہے، جس کے مطالعے سے واضح طور پر اپنا ماضی مربوط اور مسلسل صورت میں جان کر ہم اپنے مستقبل کی بھی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ کاش اردو ادب کی تاریخ بھی اس نہج پر مرتب کی گئی ہوتی۔ آج ہم مولانا مودودیؒ جیسے ادیب کو تاریخ ادب میں نمایاں، بلکہ انقلابی مقام دینے کی جسارت کر رہے ہیں، تو ہمیں خود احساس ہے کہ مورخین و نقادان ادب کی محفل سے خود کو بالکل الگ تھلگ اور تنہا پا رہے ہیں اور گویا بظاہر یہ ایک "اوپری اوپری" سی بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن اگر دوسری زبانوں کی طرح اردو کی تاریخ بھی افکار و تخیلات کی صحیح، سائنسی شعبہ بندی کے مطابق کی جاتی تو یہ اوپرے پن کا احساس نہ ہوتا۔

آخری کڑی، سید ابوالاعلیٰ مودودی: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق آج دنیاے اسلام کا بچہ بچہ اور بقیہ دنیا کا بھی بیشتر حصہ واقف ہے کہ وہ ایک تاریخ ساز ہستی تھے۔ ان کے افکار، ان کا قوی ایمان، ان کی بے نظیر تربیت و تزکیہ نفس، ان کی تنظیمی صلاحیت، غرض جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو صدیوں میں خوش قسمتی ہی سے کسی قوم کے حصے میں آجاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں ان کی تمام دوسری وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں سے قطع نظر کر کے صرف ان کی ادبی حیثیت متعین کرنی ہے۔

اوپر ہم پڑھ چکے ہیں کہ اقبال نے ادب کو "اسلامیت" کا تخیل دیا جو ان سے پہلے "مسلم قومیت" سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں کے اہم مگر نازک فرق کو عوام تک پہنچانے اور واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ مسلم قومیت کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اسلامیت کے بالکل دوسرے۔ لیکن یہ کام نہ تو اقبال نے کیا، نہ یہ ان کے کرنے کا تھا۔ وہ ایک تصور کی اصلاح کر رہے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے شعر کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ استعارے کی زبان میں، انھوں نے پٹڑی سے اتری ہوئی ٹرین کو پٹڑی پر رکھنے کا کام کیا تھا، جو ایک کرین کرتی ہے۔ اس کرین سے ریلوے انجن کا کام کسی طرح نہیں لیا جا سکتا کہ وہ گاڑی کو صحیح سمت میں لے بھی چلے۔ اس کے لیے قدرت الٰہی نے ایک نثرنگار کو پیدا کیا۔ کیونکہ جو چیز نظم میں مجمل اور محدود ہوتی ہے وہی نثر میں مفصل اور لامحدود طور پر ادا کی جا سکتی ہے۔

اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعے ملت کو جو شعور ذات بخشا تھا وہ اپنی جگہ تھا تو بالکل صحیح، مگر اس کی تفصیلات پر، انھوں نے کچھ نہ کہا۔ وہ اگر کہنے کے اہل بھی ہوتے تو نہ کہہ سکتے تھے۔ اول تو نظم کا یہ کام ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کہ تفصیلات مہیا کرے، دوسرے یہ ایک نئی آواز تھی۔ یہ جب تک ملت کو اچھی طرح ہضم نہ ہو جاتی، اس کی تفصیلات بتانے کی گنجایش ہی نہیں نکل سکتی تھی۔ اقبال نے صرف اس طرف اشارہ کر کے ہی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اقبال کے اس "ماٹو" کو واضح کرنے کا فرض جس ہستی نے انجام دیا، وہ مودودیؒ کے سوا کوئی نہ تھا۔

مولانا مودودیؒ کا سارا لٹریچر جس قسم کے افکار، دلائل اور مباحث سے لبریز ہے اس پر تبصرہ کرنا تو مولانا کے عمومی سوانح نگار یا فکر اسلامی کے مورخ کا کام ہے۔ ہمیں یہاں صرف اس کے ادبی پہلو سے غرض ہے۔ اس سے پہلے ہم نے دیکھا کہ شبلی نے ادب کو دین میں سمو دیا تھا اور اس طرح وہ پہلے مصنف بن گئے تھے جو مولوی ہو کر بھی ادیب کہلائے۔ ان کے بعد یہ سعادت صحیح معنوں میں مولانا مودودی کے حصے میں آتی ہے، جنھوں نے ادب کا وہ اسلوب اختیار کیا جس کو عوام و خواص سب پڑھ کر ادبی حظ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ فلسفہ اسلام پیش کرتے ہیں مگر افسانے کی سی لطافت اسے پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ سیاسی موضوعات پر بحث کرتے ہیں مگر اس میں کہانی کا لطف آتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو تقویٰ اختیار کرنے پر راغب کرتے ہیں مگر اسے دل کش نظم کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ غرض وہ جو بات بھی لکھتے ہیں اس میں ادبی خوبیاں اور فکری لطافتیں سموئی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کی زبان عہد حاضر کی بے تکلف، رواں اور گوارا زبان ہے، جسے مقامی محاوروں یا اصطلاحوں سے دل کشی مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ ان کے افکار دینی ہیں لیکن دینی مکاتب فکر کی روایتی مصطلحات سے پاک عبارت میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کا اسلوب متین و باوقار ہے، مگر مولویانہ گراں بار اور پُر تکلف طرز اظہار کا اس میں دخل نہیں اور کیوں نہ ہو، انھوں نے دین کو اپنی پوری زندگی پر حاوی کرنے کی دعوت دی تھی۔ دین و دنیا کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا تھا، جیسے ان سے قبل علما کا شیوہ تھا اور اسی لیے ان کی دینی تحریر اور گھریلو گفتگو میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ مولانا کی زندگی ہی جب دین کے تابع تھی تو ان کی دینی اور گھریلو تقریر میں کوئی فرق نہ ہو سکتا تھا۔ انھی کی تحریروں سے ایک طرف اہل دین نے یہ سیکھا کہ دینی موضوعات پر بھی افسانے کی زبان میں قلم فرسائی کی جا سکتی ہے تو دوسری طرف اہل دنیا کو معلوم ہوا کہ دینی تحریر بھی ادبی دل چسپی رکھ سکتی ہے۔ شبلی کے ہاں بھی یہ دل چسپی ہے، مگر اس کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ دین کے کسی موضوع پر علمی استفادہ کر لیا جائے۔ برخلاف اس کے، مولانا کی تحریر سے دل و دماغ متاثر ہو کر عملاً اپنے رجحانات زندگی کو بدلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

مولانا کے ہاں میں نے دو اسالیب بہت واضح طور پر جدا جدا پائے۔ ایک ان کی نوجوانی کا دور ہے، جس میں روانی اور زور بیان اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں استدلال اور سنجیدگی تو ہے مگر شعلے کی سی لپک۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور طوفان کا سا دبدبہ بھی ہے۔ وہ قاری پر بجلی اور آندھی کی طرح چھا جاتے ہیں۔ یہ کیفیت سرسید کی تحریروں میں بھی ملتی ہے مگر اس میں کسی قدر گرانی اور پرانا پن ہے، جس سے مولانا کی تحریر پاک ہے اور اس طرح بھرپور تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ البتہ عمر اور تحریک اسلامی کی قیادت کی ذمہ داریاں بڑھ جانے کے بعد ان کا دوسرا اسلوب پیدا ہوا جس میں اعتماد اور ٹھہراؤ کی فضا ملتی ہے۔ اس فرق کے علاوہ باقی تمام خصوصیات ان دونوں اسالیب کی یکساں ہیں۔

مولانا نے اپنے پیش رؤوں سے پورا پورا استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان کی تمام خوبیاں اپنانے اور خامیاں ترک کرنے کا موقع بھی انھیں اچھی طرح ملا اور ایک سچے ادیب کی طرح انھوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اسی لیے تو ان کی تحریر ان تمام بزرگوں کی خصوصیات اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اور اس کا اثر بھی ہمہ گیر ہے۔ آج ہم مولانا کی تحریروں کے اثرات کا حقیقی اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ اگرچہ اس وقت غالباً انھی کی تصانیف سب سے زیادہ پڑھی جانے والی ہیں، اور ان کے متعدد زبانوں میں تراجم ہو جانے کے بعد بیرونی دنیا کے لوگ بھی ان سے آشنا ہو گئے ہیں، لیکن ان سے اثرپذیری کا جائزہ افکار کی حد تک لیا جا سکتا ہے۔ البتہ آیندہ جب ہمارے بعد آنے والی نسلیں یہ دیکھیں گی کہ اردو کے ادیبوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مولانا کا کتنے وسیع پیمانے پر اپنی نگارشات میں اتباع اسلوب کیا ہے، تبھی یہ جائزہ لیا جا سکے گا، ویسے اس کے اثرات کچھ نہ کچھ نمودار ہونے بھی لگے ہیں۔ "اہل مدرسہ" نے اپنی تحریروں کو رواں، شگفتہ اور بے تکلف بنانے کی سعی شروع کر دی ہے اور اہل میکدہ نے بے راہ روی اور غیر ذمہ داری سے احتراز کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب پورا مسلم معاشرہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اس رنگ میں رنگ جائے گا جسے مولانا نے مسلم ملت کا آئیڈیل قرار دیا ہے--- اور واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ اس سمت میں کچھ نہ کچھ پیش رفت کر بھی رہا ہے، تو اس دور کا ادیب بھی خود بخود یہی اسلوب اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور تبھی اس جائزے کی نوبت آئے گی کہ سِلسلۃُ الذّھَب کی اس آخری کڑی نے ادب پر کیا اور کتنے گہرے اثرات چھوڑے۔

سید مودودیؒ سے قبل اردو ادب ہر طرح کے اصناف اور شعبوں سے آشنا ہو چکا تھا، ہر قسم کے اسالیب اور انداز ہائے بیان اس میں داخل کیے جا چکے تھے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان سب خصوصیات کو یکجا کر کے فکر اسلامی کا تابع بنا دیا جائے۔ یہ کام سید موصوف نے کر دکھایا اور اب اس نمونے پر لکھنے والے آہستہ آہستہ تعداد اور کیفیت دونوں میں بڑھتے جا رہے ہیں اور اب بظاہر کسی نئے انقلابی ادیب کے آنے کے آثار ہیں نہ گنجایش۔

© rasailojaraid.com